حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol.7 No.3 2023

راشد کی نظم میں فلسفیانہ مباحث

(وجودیت کے تناظر میں)

محمد محبوب حسین

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریایونیورسٹی، ملتان

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی

صدرِ شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریایونیورسٹی، ملتان

Abstract:

Existentialism is a 19th century philosophical movement that not only left a profound impact on literature but also influenced other fields of art such as theatre, paintings and film with its thought system. Any ideology gets its structural and intellectual framework from the society itself. A phenomenon or social change can be considered as the starting point of an ideology. In this research paper, the existential elements in Rashid's poem will be examined.

کلیدی الفاظ: وجودیت، وجودی کرب، متقاضی، نفسیاتی پیچیدگیاں، جدید اردو نظم، ن م راشد،

بیسویں صدی کا ادب عالیہ بجاطور پر وجودیت، اثباتیت، علامتیت، جنسیت اور مارکسیت کے رُجحانات میں پلا بڑھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہ وہ تصورات ہیں جو زندگی سے دوری کا ڈھب نہیں سکھاتے بلکہ جیون کو ایک خاص ادا اور قرینے سے بھرپور جینے کا درس دیتے ہیں۔ یہ وہ علمی رُجحانات ہیں جو علم و فن کے ذریعے زندگی کی تصویر میں ہمیں رنگ بھرنا سکھاتے ہیں۔ کیونکہ اِنھیں فلسفہ حیات کی آگ میں کندن کیا گیا ہے۔ ان نظریات نے ایک تسلسل سے زندگی کے رنگ روپ کو نکھارا ہے۔ ان سے ادب بھی ثروت مند ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وجودی مفکرین اور ادیب اپنی تحریروں میں الگ سے کوئی نظریہ یا اُصول پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے فن پارے میں (چاہے وہ ناول ہو، افسانہ، ڈرامہ ہو یا کوئی نظم ہو) کرداروں کے ذریعے طرزِ حیات پیش کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یوں اپنے فن پاروں میں طرزِ حیات پیش کرنے کے اِس عمل کے پس منظر میں شاید ہیگل کے خلاف اُس کا نظریاتی ردِ ہے۔ (علمی سطح پہ) کیونکہ ہیگل نے انسان کو اشرف المخلوقات ماننے سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسان بھی دیگر مظاہر فطرت کے برابر ہے اِسے اُن پر سی بھی طرح کا کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ یوں انھوں نے انسان کے پندار کو ٹھیس پہنچائی۔ ہیگل نے اِس وسیع و عریض کائنات میں کل کے ایک جزو کے طور پر رہتا Supper Creation ہے۔ اِس لئے اِس جُز کو کسی اور جزپہ کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ بجاطور پر ہیگل نے یہ کہہ کر اثباتی علوم کو مہمیز لگائی لیکن خود کو ہزاروں برسوں سے نے آغاز کیا۔ ہیگل کا شمار اِس کی بانیوں میں ہوتا ہے، Idealism کے خلاف Naturalism سمجھنے والے انسان کو اَناپہ یہ ایک کاری ضرب تھی۔ یہاں سے of the God لیکن تھوڑے ہی وقت میں تصوریت بھی اُس طرح سے انسان کے کام نہ آسکی جس طرح سے اُسے آنا تھا۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تصوریت انسانی ذات کی حقیقت اور اہمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے کسی اور چیز کے حصول میں معروف ہوئی، اِسی کاردِ عمل تھا جس نے آنیوالے دنوں میں وجودیت کا نام اور روپ دھارا۔

ن۔ م راشد اُردو کی جدید نظم کا سنگ میل ہے۔ اُنھوں نے اُردو نظم کو معنوی اور ہیئتی اعتبار سے بہت ثروت مند کیا۔ اُنھوں نے اُردو نظم کو نت راہ دکھائے۔ راشد فکر کے عمومی راستوں کو تیاگنے کا ہی درس دیتا ہے۔ اِس لیے مطالعہ راشد میں اِس بات کا متقاضی ہے کہ اُسے عام ڈگر سے ہٹ کر پرکھا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں جن جن سیاسی، معاشی اور علمی و فکری تحریکوں نے مغرب میں اپنی تشکیل کی وہ ہمارے ہاں بیسویں صدی کے پہلے دو تین عشروں میں پھل پھول چکی تھیں۔ اب اِن تحریکوں کے اثرات عالمگیر ہو گئے تھے۔ اِس ہماہمی کے عہد میں اُردو کے شعری ادب میں ن۔ م راشد وہ یکتا و یگانہ شاعر تھے جو عمومیت سے بہت دور اپنی الگ راہیں کھوجنے میں حرف و معنی کے نہایت کٹھن اور بالکل تازہ جہانوں میں پرواز کر رہے تھے۔ بجاطور پر راشد نے اپنی نظم میں ایک ایسے آزاد فرد کی تمنا کی جسے کسی بھی طرح کے اوہام، توہمات اور دیگر رکاوٹوں میں بالکل بھی نہ اُلجھایا جا سکے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

بیسویں صدی میں جب ایک آزاد فرد کے انفرادی تجربے، مشاہدے، نفسیات، مسائل، مایوسی کے موضوعات کو ہمارے شعراء نے نظم میں راہ دی۔ راشد کی نظم باغیانہ روش سے اپنے نقوش مرتب کرتی آگے بڑھتی ہے۔ اِس میں ہمیں مغائرت بھی پہلو بہ پہلو چلتی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ غیریت ہمیں راشد کے پہلے مجموعے سے نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے مجموعے ماورا سے نظم رُخصت کا ایک اقتباس دیکھیں:

مجھ سا بھی کوئی ہوگا سیہ بخت جہاں میں

مجھ سا بھی کوئی ہوگا اسیر الم و یاس

مجبور ہوں، لاچار ہوں، کچھ بس میں نہیں ہے (۱)

انسان کی بے بسی، مجبوری و سیاہ بختی کا یہ احساس رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اِس بے چینی میں اِس شدت سے اضافہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے خدا تک کو گنوا بیٹھتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا نظم کے بعد "ماورا" میں "انسان" کے عنوان سے ایک نظم "سانیٹ" ہے جس میں نوبت اِس جا رسید کہ آپ کو وجود خدا پہ سوال اُٹھانا پڑ جائے۔

میں اکثر چیخ اُٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر

جنوں سا ہو گیا مجھ کو احساس بضاعت پر

ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں "ہماری" ہیں!

کسی سے دور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا!

خدا سے بھی علاج دردِ انساں ہو نہیں سکتا (۲)

یہ جو اِس دُنیا میں بسنے والے اُفتادگان خاک ہیں جو تیسرے درجے کی مخلوق کے مرتبے سے جیون گزارتے ہیں۔ ایسے سماجوں میں تصورِ خدا بھی ایک نہایت قوی و طاقتور جس نے تقدیر کو اپنے قبضہ اختیار میں رکھا وہ بھلا کیونکر انسان کے لیے قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ راشد نطشے کی طرح ایک سطح پہ یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا دائرہ اختیار یا قدرت محدود و کمزور ہو رہی ہے۔ اِس لیے ہمیں اُن کے فرد کی تشویش کا اظہار ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے آنے تک تو فرد کی تشویش عقلیت کے ساتھ ساتھ معدومیت Nihillism تک پہنچی۔ معدومیت فرد کے لیے ایک اور تشویش یا عذاب لائی۔ کیونکہ اِس سے سزا و جزا کا جو حتمی تصور تھا اُس کی بنیادیں ہل گئیں کہ نیستی نے کسی بھی ایسے بیرونی طاقت کو رد کر دیا جو انسانی فیصلوں کی جواب دہی کر سکے۔ عزیز احمد نے کبھی راشد کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ

"راشد فطرت کو دیکھتا ہے اور اِس طرح سہل انگار لاادریت (لادینی) کی طرف اُن کا قدم اُٹھتا ہے۔ جس زندگی میں جنس کے برابر کوئی قدر نہ ہو اُس میں موت کی خواہش ضروری ہے۔"

> جوانی کے ابتدائی ایام کے رومان کی غیر آسودگی اور موت کی خواہش ہمیں پاسکل اور کرکیگارڈ کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ خود تحقیری کا احساس وجودیوں کے لیے ناقابل بیان واقعہ بن جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا ہم پر ہنس رہی ہے۔ کرکیگارڈ کو اِس لمحے اپنے آپ کو گولی مار دینے کی تمنا کرتا ہے۔ (۳)

اُن کے پہلے مجموعے "ماورا" کی ایک اور نظم "گناہ اور محبت" میں وجودی اصطلاحات کا بدرجہ اُتم استعمال باور کراتا ہے کہ اُن لاشعوری طور پر بھی اِس نظریے سے کس قدر علاقہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے قارئین کو اِس سے وجود اور اُس کے معاملات کو سمجھنے میں کوئی دقت یا مشکل ہو تو ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ وجودیت کے موضوعات میں داخلی ،خوشی، بے چارگی، اُکتاہٹ، نااُمیدی، گھِن، دہشت و کرب، جرم، تصور بیگانگی یا مغائرت۔ یہ وہ موضوعات جن کا ایک گہرا Temporality وارداتیں، موت، نیستی، زمانیت رشتہ وجودیت کے ساتھ جُڑا ہوا ہے۔ اب ہم جن نظموں پہ بات کر رہے ہوں اُن میں یہی موضوعات زیر بحث ہوں گے۔

ہم راشد کی نظم میں یاسیت اور اُس کی فضا بارے کچھ جاننے کی ایک اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ راشد کی نظموں میں یاسیت کی اِس صورت کی ایک سماجی لاحاصلی کی سی ہے جس میں زندگی کی بے معنویت جھلکتی ہے۔ بھلے اِس بے معنویت کو لایعنت سے بھی کوئی علاقہ نہیں مگر اِس کے پس منظر میں سامراج کی کارستانیاں ضرور نظر آتی ہی۔

جیسے کبھی سارتر نے کہا تھا کہ "ہماری زندگی عام طور پر ایک ڈگر پر چلتی رہتی ہے ہم اشیاء کو ایک دوسرے کے متعلق دیکھتے ہیں۔ واقعات عالم میں نظم و ضبط کا مشاہدہ کرتے ہیں اور موجودات کائنات کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسی راہیں سامنے آتی ہیں اور ایسے نئے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ ہم خود اُن کو نئے یا بدلے ہوئے حالات

سے صحیح طور پر عہدہ بر آ ہونے کو تیار نہیں کر پارے"۔ یہ زندگی کا وہ مقام ہے جہاں یاسیت ایک سماجی بے معنویت میں بدلتی ہے، عموم میں اِس کے پیچھے کسی آباد کار کا جبر ہوتا ہے۔

راشد کی ایک نظم ہے "اسرافیل کی موت" یہ نظم اُن کے چوتھے مجموعہ میں شامل ہے، ذرا یہ اقتباس نظم ملاحظہ ہو۔

مرگ اسرافیل سے
حلقہ در حلقہ فرشتے نوحہ گر،
ابن آدم زلف در خاک ونزار
حضرت یزداں کی آنکھیں غم سے تار
آسمانوں کی صغیر آتی نہیں
عالمِ لاہوت سے کوئی نفیر آتی نہیں(۴)

ایک سکوت بے کراں کا عالم ہے۔ایسا سناٹا یا چُپ کہ جس میں آپ کو چپ کی آواز سنائی دے۔مطلب کوئی ایسا سماجی زوال اور سیاسی انحطاط ہے کہ فرد اور اُس کی تمام تر وجود ایک طرح کی خستہ حالی اور بے یقینی کے گھڑے میں اُترتا جا رہا ہے۔اسرافیل جو خدا کا ایک مقرب فرشتہ ہے جس کی ذمہ داری روزِ قیامت صور پھونکنا ہے۔کہتے ہیں جیسے ہی وہ اپنا صور پھونکے گا تب ہر شے روئی کے گالے کی طرح اُڑتی ہوئی نظر آئے گی۔ہر طرف سکوتِ مرگ کی دہشت ہے۔ایک زوال ہے جو نظم کے ہر حصے سے پکار پکار اُٹھتا ہے:

مرگ اسرافیل سے
اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، پتھرا گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا
ایسی تنہائی کہ حُسنِ تام یاد آتا نہیں
ایسا سناٹا کہ نام یاد آتا نہیں (۵)

زندگی کے ہر طرف ایک بنجر پن کا پھیلاؤ ہے جو کہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔اِس سے نہ صرف سماجی زندگی متاثر ہے بلکہ تخلیقی روّیوں کو بھی یہ دیمک کی طرح چاٹتا دکھائی دیتا ہے۔تخلیقی نمو کی موت حیات کے باہم رابطوں کی موت کے قریب کی بات ہے۔تمام تر دانش کی موت ہے۔حیاتِ ازلی و ابدی کی موت ہے۔اسرافیل جس نے اپنے صور یا قرنا کے ذریعے سبھوں کی موت کا اعلان کرنا تھا۔اب وہ مر گیا ہے تو اُن کی موت کا اعلان بھلا کون اور کیسے کرے گا۔یہاں سے راشد کی اِس نظم کا یہ اقتباس وجودی اعتبار سے اور بھی بامعنی اور بلیغ ہو جاتا ہے۔

مرگ اسرافیل ہے
گوشِ شنوا کی، لب گویا کی موت
چشمِ بینا کی، دلِ دانا کی موت
تھی اُسی کے دم سے درویشوں کی ساری ہاؤ ہو
اہلِ دل کی اہلِ دل سے گفتگو
اہلِ دِل ...... جو آج گوشہ گیر و سُرمہ در گلو!
اب تنانا ہو بھی غائب اور یا رب ہا بھی گم
اب گلی کوچوں کی ہر آوا بھی گم

!یہ ہمارا آخری ملجا بھی گم

جیسا کہ ہماری مابعدالطبیعاتی روایات میں ہے کہ جب اسرافیل پہلی بار صور پھونکیں گے۔اُن کے قرنا کی پہلی آواز پہ ساری زندہ مخلوق مر جائے گی اور جب دوسر بار صور پھونکیں گے تمام مردے جی اُٹھیں گے۔لیکن یہاں راشد کی نظم میں اسرافیل کی موت درحقیقت جامعہ و ساکت سماج یا جہان کو پھر سے ایک نئی زندگی کی طرف منتقلی کا عندیہ بھی ہے۔اِس میں یاسیت اور بے معنوی کا پہلو بھی شدید توانا ہے کیونکہ اسرافیل کی موت کی علامت کے پیچھے دراصل باعث مسرت تمام فنون و دانش کی موت ہے۔یہ وجودی تصور کے حامل انسان کی بھرپور عکاسی ہے۔

وجودیت نے ایک منفرد کام یہ بھی کیا ہے کہ اُس نے فرد کی داخلی صورت کو نئے انداز سے دیکھا، اِس نے پہلے کبھی اُسے ایسے نہیں دیکھا گیا۔اس کے مطابق فرد کا جذبہ یا احساس ہی بنیادی اہمیت کی حامل چیز ہے۔وجودیت پسندوں کا یہ ماننا ہے کہ فرد کو جن باتوں سے اپنا وجودی ادراک ملتا ہے وہ اُس کی جذباتی کیفیات اور موضوعی مسائل ہوتے ہیں۔آگے چل کر فرد کو اِس شے سے دوروں بینی کا ہُنر آتا ہے پھر اس کی مدد سے وہ خود بین وجود آگاہ ہوتا ہے۔اِس سلسلے میں راشد کی نظم "اے غزال شب" ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔جن احباب کو یہ نظم پڑھنے کا اتفاق ہو چکا ہے وہ با آسانی یہ جان سکتے ہیں کہ غزال کی ذات سے متکلم کچھ نہ کچھ ربط و تقاضا رکھتا ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غزال کو متکلم سے کچھ خواہش ہے۔کیونکہ متکلم اِس بات کو آشکار کرتا ہے کہ غزال شب کی کوئی پیاس ہے جسے اُسے بجھانا ہے۔اب دیکھیں حقیقت میں تو غزال شب کا وجود ہی یہ باور کراتا ہے کہ اُس کے تئیں میرے کچھ واجب ہیں۔بظاہر (نظم کے متن سے) دونوں میں کوئی جسمانی تعلق بھی نہیں دکھائی دیتا بلکہ ہر دو کی اپنی اپنی داخلی واردات ہے جس کی بدولت دونوں خود بیں و خود آگاہ نظر آتے ہیں۔

اے غزال شب،
تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو میری جاں میں ہے؟

نظم کے اِس مختصر ٹکڑے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کسی فرد کی کوئی جذبی حالت ہے جس سے اُسے پہلے مرحلے پہ یہ اپنے وجود کا ادراک ہوتا ہے اور اگلے مرحلے میں خود آگاہی، نظم کے ایک اور مختصر سے اقتباس میں جھانکیں تو بات زیادہ روشن ہوتی ہے کہ کس طرح ایک داخلی واردات وجودی کیفیت میں ڈھل کر کسی خوف یا معروضی حادثے امکان سے کلام کرتی ہے۔

اے غزال شب
اُس فتنہ کار سے چھپ گئے
میرے دیر و ور بھی خواب میں
میرے نزد و دور حجاب میں
وہ حجاب کیسے اُٹھاؤں میں جو کشیدہ قابل دل میں ہے
کہ میں دیکھ پاؤں درون جاں
جہاں خوف و غم کا نشان نہیں
جہاں یہ سراب رواں نہیں
اے غزال شب! (٦)

یہ جذبی کیفیات کے نتیجے میں ملنے والی دروں بنی ہے۔جس کے ذریعے متکلم (فرد) اپنی روح اور اپنے قلب و ذہن کے اندر تک دیکھنے لائق ہوتا ہے۔شاید وہاں کوئی خوف و غم نہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظم میں جہاں ایسی صورت پیدا ہوتی ہے کہ کب فرد اپنے درون دیکھنے کی سکت گنوا دیتا ہے۔آغاز نظم میں وہ کونسا سراب ہے جو متکلم فرد کی جان پر مسلط ہے۔اس حوالے سے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

یہ خوف کیا ہے اور کیوں ہے کہ اِس نے متکلم کے وجود پر ایک غالب اور ہمہ گیریت بن کر ہر چیز کو حجاب، یا حجاب خواب میں ڈال دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خوف خود آگہی کا خوف ہو، متکلم کو اپنے پورے وجود کی خبر نہیں اور اِنسان ہر اُس شے سے ڈرتا ہے جسے وہ نہیں جانتا، متکلم نے اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔(۷)

ایک مسلسل خوف ہے جو فرد کے وجود اور آزادی کو بار بار کچلتا ہے۔یہ کبھی محض زندہ رہنے کے سبب سے ہے تو کبھی زندگی کے مسائل کے سبب سے۔یہ بے یقینی یہ ثباتی بندے کو کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔جیسے راشد کے پہلے مجموعہ ماورا میں ایک نظم میں "ہونٹوں کا لمس" یہ نظم ہمیں پورے یقین سے وجود کے فانی ہونے کا عندیہ دیتی ہے۔کیونکہ فرد کئی زمانوں میں عقائد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔اُسے اجارہ دار عقائد خیر و شر اور نیک و بد میں کوئی عقلی و انسانی حد قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ حزن و غم کی ایک صورت فرد کے وجود کے انکار سے جنم لیتی ہے۔اِس لیے راشد کے ہاں افلاطونی کی نوک پہ رکھا گیا ہے۔ایک وجودی کی طرح راشد جسم کی موجودگی و آسودگی کو ہی اہم جانتے و مانتے ہی۔ عشق کو طنز

جسم ہے روح کی عظمت کے لیے زینہ نور

!منبع کیف و سرور

نارسا آج بھی ہے شوقِ پرستار جمال

اور انساں ہے کہ ہے جلوہ کشِ راہ طویل

(کلیات راشد،ص72)

یہاں راشد نے جسم کو روح کی عظمت کے لیے زینہ نور قرار دے کر انسان کو مختلف ضابطوں میں جکڑنے والوں کو طاقتور جواب دیا ہے۔جسے اُنھوں نے نظم کے آخری حصہ مکیں یزداں کے تمسخر کا جواب قرار دیا ہے۔یہاں آ کے وجودی معنوں میں زینہ نور کی علامت نہایت بلیغ و توانا ہوگئی ہے۔دھج اور اعتماد :سے وہ کہتے ہیں

حسن بے چارے کو دھوکا سا دیے جاتا ہے

!ذوق تقدیس پہ مجبور کیے جاتا ہے

ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار

مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب

ہے یہی حضرت یزداں کے تمسخر کا جواب(کلیات راشد،ص73)

راشد کے ہاں موجودگی اور وجودگی ایسے بڑے بڑے اور واشگاف تجربے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔اُن کی نظم "سپاہی" ہو کہ "ایک رات" یا "زوال" سب میں وجودی اظہار کے طاقتور پیرائے کا استعمال سامنے آتا ہے۔وہ فرد کے ہاں جنس کی خواہش اور موجودگی کو درحقیقت اثبات وجود سے جوڑ دیتے ہیں۔ نظم "اظہار" میں اِس کا توانا اظہار ملاحظہ فرمائیں۔

کیسے میں بھول جاؤں

زندگی سے اپنا ربط اولیں؟

روح کا اظہار تھے بُو سے میرے

جیسے میری شاعری میرا عمل

روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں؟

کیسے کر ڈالوں میں جسم و روح کو

آج بے آہنگ و نور؟ (۸)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

بے آہنگ و نور ہونا وجودی کرب کی علامت ہے۔ایسی تمام نظموں کو راشد کی ذاتی زندگی کے حدود اربعہ میں محدود ہو کر دیکھنے کی بجائے متکلم کی حیثیت سے دیکھیں تو اِن کا فکری و معنوی کینوس وسیع ہو جاتا ہے اِس کا اظہار راشد نے خود بھی کیا کہ یہ میری ذاتی زندگی کی وارداتیں نہیں، اِنھیں اِس سے نہ جانچا اور پرکھا جائے۔

یہ خطہ جسے ہم ہندو پاک کا نام دیتے ہیں قریب پانچ ہزار برسوں سے سامراجیوں کے نشانے پہ ہے، اِستعمار کی آخری بلاواسطہ شکل فرنگی تھے جو قریب ڈھائی سو سال یہاں قابض رہے۔غلامی کے اِس تسلسل نے ارتقاء و نموپذیری کے تمام تر چشموں کو بے آب و گیاہ کر دیا۔غلامی اور لوٹ مار نے اُنھیں پست قامت قبول پہ مائل کیا۔راشد نے اپنی شاعری کے ابتدائی برسوں اور عروج میں نہ صرف یہ ماحول دیکھا اور جیا بلکہ اُنھیں مختلف ممالک میں استحصالیوں اور اُن کے ظالمانہ نظام کے مضمرات کو بذاتِ خود دیکھ اور جان چکے تھے۔راشد کے ایک خط جو اُنھوں نے آغا عبدالحمید کے نام لکھا یوں اظہار کرتے ہیں۔

> انگریزوں اور امریکیوں کے ساتھ قریبی ربط سے احساس ہوا ہے کہ زندگی بہت حقیر ار ادنیٰ چیزوں کا مجموعہ ہے۔آسمانوں اور ستاروں اور کہکشاؤں کا مجموعہ نہیں۔(۹)

اِسی طرح راشد نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ فرد کو بطور ایک ذات کے جو اہمیت ہمارے زمانے میں ملی ہے، اپنی سمجھ کے مطابق وہ ہرگز جدید سائنسی معاشرے کیوجہ سے نہیں بلکہ اِسی سماج نے اِنسان کی ذات پر جو ضرب کاری لگائی ہے یہ اُس کے رد کے طور پر سامنے آئی ہے۔اِس لیے بیسویں صدی کے فلسفیوں اور ماہرین نفسیات نے ایک بار پھر فرد کی ذات کو اہمیت دینا شروع کیا۔سائنس اور صنعت و حرفت کی روز افزوں ترقی نے بے ہودہ جنگوں کی خاطر انسان کو اجتماعی دیوانگی سے دوچار نہیں کر دیا۔سماجی فلسفیوں نے اِس دیوانگی کا سب سے مؤثر حل اور علاج یہی بتایا کہ اِنسان اپنی مکرر شناخت کے لائق بنے تاکہ وہ سائنسی و صنعتی اقدار کے بے پایاں قلزم میں اپنا آپ نہ ڈبو بیٹھے بلکہ اپنی جداگانہ وجودی شخصیت کھوج نکالے اِس لیے ہم دیکھتے ہیں راشد کی نظم "پہلی کرن" فرد کی آزادی اور ذات کو نگلنے کے درپے نظام پر کس طرح اُنگلی رکھتی ہے۔

کوئی مجھ کو دورِ زماں سے نکلنے کی صورت بتا دو
کوئی یہ سُجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستیِ رائیگاں سے؟
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی! (۱۰)

ہمیں اِس نظم کے اسلوب و اصطلاحات میں سب تجسیم و تفہیم کھینچ کر وجودیت کے دائرے میں لاکھڑا کرتی ہے جیسے اس نظم کی تراکیب کو ہی لے لیں، ہستیِ رائیگاں، نکلنے کی صورت، عبث بن رہا ہے، ان سب کے مفہوم و جودیت کی زبان میں کہی جانے والی لغویت یا لایعنت اپنے پورے چہرے کے ساتھ کلام کرتی نظر آتی ہے۔اِس کے حواشی میں یہ درج ہے کہ یہ نظم کسی نیگرو (حبشی) سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔جسے سامراجیوں نے دوسرے درجہ کا شہری قرار دے رکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔راشد، ن، م، کلیات راشد، ماورا پبلشرز لاہور، اشاعت اوّل،۱۹۸۸ء، جنوری،ص۲۲

۲۔ایضاً،ص۵۲

۳۔شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اُردو نظم میں وجودیت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت۲۰۰۱ء،ص۹۸

۴۔راشد، ن، م، کلیات راشد، محولہ بالا،ص،۲۸۳۔۲۸۴

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

۵۔ایضاً،ص۲۸۵

۶۔ایضاً،ص۳۲۵

۷۔فاروقی، شمس الرحمن، ن۔م۔راشد اور غزال شب، مشمولہ ن۔م۔راشد۔حرف و معنی کی جستجو، مرتب ڈاکٹر رفاقت علی شاہد، مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت۲۰۱۵ ء، ص۲۹،۳۰

۸۔راشد، ن، م، کلیات راشد، محولہ بالا،ص ۸۳،۸۴

۹۔شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اُردو نظم میں وجودیت، محولہ بالا،ص ۱۰۲

۱۰۔راشد، ن، م، کلیات راشد، محولہ بالا، ص۱۱۳